Date of Publication : 16-10-2014 PRICE Rs. 2/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01 ON 17-18 Oct. 2014 R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 October 2014
Issue: 40, Vol.:73

۲۲ تا ۲۸؍اکتوبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۴۰، جلد نمبر: ۷۳

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی ساحر لدھیانوی کی ۲۵؍اکتوبر کو یومِ وفات ہے۔ ساحر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اس شمارے میں جناب خواجہ احمد عباس، جناب مخمور سعیدی اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان میں ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر نہایت عمدہ طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس اور مخمور سعیدی کے مضامین رسالہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۰ء سے ماخوذ ہیں۔

۱۷؍اکتوبر سر سید احمد خاں کی یومِ ولادت ہے، اس مناسبت سے جناب مظفر حسین سید کا مضمون صفحہ آخر پر شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

ساحر جو 'ہے' سے 'تھا' ہو گیا

خواجہ احمد عباس

ساحر کو میں اپنے سے بہت کم عمر سمجھتا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ موت کے وقت 59 سال کے تھے یعنی میں اُن سے سات سال بڑا ہوں۔ پھر وہ اتنے کم عمر کیوں نظر آتے تھے اور کیوں چھوٹے معلوم ہوتے تھے؟

ایک تو یہ وجہ کہ وہ خوب صورت ہونے کے علاوہ خوش لباس، خوش گفتار اور خوش اخلاق واقع ہوئے تھے۔

ہمیشہ سفید براق قمیض اور پتلون میں ملبوس نظر آتے تھے۔ اُن کی گاڑی کا رنگ بھی سفید ہی تھا۔ کوئی میل اُن پر چڑھی ہی نہیں تھی۔

بات ہمیشہ (خصوصاً مجھ سے) اتنے ادب سے کرتے تھے کہ لامحالہ بہت چھوٹا ان کو ماننا پڑتا تھا۔ اُن کے جانتے میں خواہ مخواہ خود کو بزرگ محسوس کرتا تھا اور وہ نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے نام کے ساتھ ماضی کا صیغہ لکھنے میں مجھے سخت اذیت محسوس ہو رہی ہے۔ وہ تو ہمیشہ 'ہے' کے صیغے میں ہی تھے۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ:

۱- ادبی شاعر بے مثال ہیں

۲- وہ پہلے اردو شاعر ہیں جن کی شاعری کی کتابیں اردو کی نثری کتابوں سے زیادہ بکتی ہیں۔

۳- وہ پہلے فلمی شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی فلمی شاعری میں ایک خالص ادبی معیار قائم رکھا بلکہ شاعروں کا رتبہ بھی فلم انڈسٹری میں بڑھایا۔ اُن کا یہ اصرار کہ میں بڑے میوزک ڈائرکٹروں اور پلے بیک سنگروں کے ساتھ گانے نہیں تخلیق کروں گا، یہ کوئی ذاتی تعلّی نہ تھی۔ یہ اُن کی شاعرانہ اور ادبی خود اعتمادی تھی کہ میں گانے کو اپنے سوا اور اپنی شاعری سے کامیاب بنا سکتا ہوں۔

اس لیے وہ تجارتی لحاظ سے 'پھسڈّے' (مگر قابل) میوزک ڈائرکٹروں کے ساتھ بہت خوشی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ کام کے بارے میں اُن کو غرور تھا نہ گھمنڈ۔ اگر دس بار بھی ڈائرکٹر اور میوزک ڈائرکٹر ان کو کچھ الفاظ بدلنے کو کہتا تو وہ کر دیتے مگر ان پر اپنی تجارتی کامیابی کی 'دھونس' کوئی نہ جمائے۔

وہ ایک چیز سے ہمیشہ ڈرتے تھے، ہوائی جہاز کے سفر سے۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ ان کو بہ اصرار ماسکو یا لندن یا پیرس یا نیویارک بلایا گیا مگر وہ ہوائی جہاز کے سفر کے خیال سے کہیں نہیں گئے۔

کار سے ہزار میل کا سفر کر لیتے تھے۔ ریل میں دو ہزار میل کا سفر کر لیتے تھے لیکن ہوائی جہاز میں بیٹھنا اُن کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اس کے پیچھے کوئی نفسیاتی اُلجھن چھپی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں کوئی بزدلی شامل نہیں تھی۔ کار خود چلاتے تھے۔ کبھی اُن کو کسی ایکسیڈنٹ سے ڈرتے نہ دیکھا۔ ایک بار میرا ارادہ تھا کہ اُن سے تفصیل سے اس نفسیاتی 'اُلجھن' کے بارے میں بات کروں گا مگر افسوس زندگی (اور موت) نے وہ موقع ہاتھ سے چھین لیا۔



ساحر لدھیانوی
ولادت: ۸؍مارچ ۱۹۲۱ء — وفات: ۲۵؍اکتوبر ۱۹۸۰ء

مرنے سے صرف تین دن پہلے میرے یہاں آئے تھے۔ بڑی دیر تک بیٹھے۔ کوئی کمزوری یا بیماری نہیں تھی۔ بات ہوئی تو ادب کی۔ ایک پبلشر نے انھیں لکھا تھا کہ آپ کی شاعری کا انگریزی میں مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ساحر کی دو تین طویل نظموں کا ترجمہ کیا تھا جو (باوجود) اپنے غیر شاعرانہ انداز کے اُن کو پسند آیا تھا۔

اس لیے اُن کا اصرار تھا کہ میں ان نظموں کے علاوہ اور نظموں اور غزلوں کا بھی ترجمہ کروں۔ میں نے حامی بھری لیکن ساحر صاحب کی تسکین نہ ہوئی۔ کہنے لگے کہ میں نے پبلشر کو یہاں بلایا ہے کہ بات آپ کے سامنے ہو جائے۔ "میرے لیے تو آپ یہ کام کریں گے مگر ہمارے آپ کے دوستانہ تعلقات کا فائدہ کوئی تاجر کیوں اٹھائے؟ کون جانتا ہے میں مر جاؤں اور بعد میں وہ آپ سے بدمعاملگی پر اتر آئے۔ اس لیے سب باتیں آپ کی موجودگی میں ہی طے ہونی چاہئیں؟"

ان کی کہی ہوئی بات میں نے ہنس کر ٹال دی۔ میں نے کہا "ساحر صاحب میں تو یوں بھی آپ سے کئی برس آگے ہوں۔ آپ کے انتقال کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا"۔

کہنے لگے ایک بامعنی ہنسی کے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ساحر اور ان کی شاعری

تحریر: سعیدی

تھا جنھیں گوا عروج دیتے ہوئے ان کے ایک سوال کے جواب میں ساحر نے کہا تھا:

''ابھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریے پر پوری نہ اترتی ہو لیکن اس سے اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال سے شدید ترین نظریاتی اختلاف کے باوجود میں ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔ لکھتے وقت ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہیے۔ جو کچھ بھی کہا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے یعنی اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو نہیں تو ان کہی بات اندر ہی اندر کوڑا بن جائے گی جو تکلیف دے گی۔ شعر کہنے کے بعد اس پر کون سا لیبل چسپاں کیا جائے گا، یہ ادیب کی نہیں لیبل فروشوں کے سوچنے کی بات ہے۔ ادب درحقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اگر وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے لیے لکھتا ہے تو اندر سے کوئی تسکین نہیں ہوگی''۔

(ملاقاتیں، صفحہ ۱۲۳)

یہ قدرے طویل اقتباس میں نے یہاں اس لیے نقل کیا کہ اس کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ ساحر کی شاعری کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ساحر شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل کو سمجھنے اور پرکھنے والی نظر بھی رکھتے تھے۔

ساحر اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور ان کی یہ وابستگی تادم آخر قائم رہی لیکن ان کی شاعری ان بندھے ٹکے موضوعات کے دائرے کی اسیر کبھی نہیں رہی جن پر اس تحریک کے قائدین زور دیتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری سچ مچ ان کی شخصیت کا اظہار ہے اور ان کے شعری رویے کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت سے قریبی شناسائی ضروری ہے۔

ساحر ایک جاگیردار باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھیں باپ کا جتنا لاڈ پیار ملنا کم تھا لیکن ان کے والد جس معاشرے کی نمائندگی کرتے تھے اس کے کچھ مخصوص آداب تھے، غیر انسانی اور جھوٹے طبقاتی وقار پر مبنی۔ ان کے والد کے جذبۂ پدری پر طبقاتی برتری کا یہ پُرفریب احساس غالب آ گیا اور یہ چیز باپ بیٹے کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ طبقاتی درجہ بندی کے خلاف ساحر کی شاعری جس شدید جذبے کی حامل ہے اسے ان کے اسی تجربے کی دین سمجھنا چاہیے:

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل، مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ بے نام اذیت جو انھیں اپنے ماضی سے ملی تھی، ساحر کا زندگی بھر پیچھا کرتی رہی اور وہ اس سے کبھی نجات نہ پا سکے۔ ان کی ایک نظم ہے 'جاگیر' جو اس کی غماز ہے کہ وہ اپنے ماضی کو اپنے لیے باعث ذلت کیوں تصور کرتے تھے۔ اس نظم کے یہ تین بند دیکھیے:

یہ لٹتے ہوئے پھول، یہ دبکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں، جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں ادھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

آخری بند میں جنسی استحصال کے جس مکروہ پہلو کی طرف ساحر نے اشارہ کیا ہے وہ بھی ان کے احساسات میں ہمیشہ نشتر بن کر کھٹکتا رہا ہے۔ ان کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ بھی ان کا ذاتی مشاہدہ تھا۔ ساحر کے والد نے پے در پے کئی شادیاں کیں، ساحر کی والدہ ان کی گیارہویں بیوی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شادیاں انھوں نے لڑکا پیدا کرنے کی خواہش میں کیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے پیچھے جنسی ہوس کارفرما نہیں تھی اور لڑکا پیدا کرنے کی اس بے لگام خواہش کو بھی جاگیردارانہ معاشرے کی ایک مخصوص لعنت کے سوا دوسرا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا لیکن جب یہ لڑکا پیدا ہوا تو صرف اس خطا پر کہ جس عورت کی کوکھ سے اس نے جنم لیا تھا وہ خاندانی طور پر ان کی ہمسر نہیں تھی، ساحر کے والد نے اسے ایک رابطہ رکھنا چاہا کہ وہ ان کی منکوحہ ہے۔ ساحر نے جب شعور کی آنکھ کھولی ہوگی اور یہ ماجرا ان کے سامنے آیا ہوگا تو رشتوں کی اس پاکیزگی کی ان کی نظر میں کیا وقعت رہ گئی ہوگی، جس کا ڈھنڈورا مہذب دنیا دن رات پیٹتی رہتی ہے۔ مردوں کی ہوس پسندی اور اس کے ہاتھوں عورت کی پامالی کا جو تصور ساحر کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے اس کی جڑیں یہیں تلاش کی جانی چاہئیں:

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

یہ ان کی مشہور نظم 'چکلے' کا ایک بند ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا پورا کا پورا معاشرہ ایک چکلے کا منظر پیش کر رہا ہے جہاں عقیدوں کا تقدس، رشتوں کا احترام، محبت، مروت، کسی کی حیثیت ایک جنس تجارت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

ساحر اپنے لڑکپن ہی سے جن مجروح احساسات کے ساتھ زندگی گزارتے رہے انھوں نے ان کی شخصیت اور شاعری دونوں پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ساحر کی حیات معاشقہ کے بارے میں بہت سی روایتیں ہیں لیکن ان تمام روایتوں میں ایک بات مشترک ہے، وہ یہ کہ ان کے ہر معاشقے کا اختتام ناکامی پر ہوا۔ اس ناکامی کی وجہ کیا تھی؟ محبوبہ کا گریز؟ غالباً نہیں۔ پنجابی کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم نے ساحر کے ساتھ اپنے عشق کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے اور ان کے لیے جس جذباتی وارفتگی کا اظہار کیا ہے وہ اس قیاس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ ساحر کی شاعری سے جس محبوبہ کی تصویر ابھرتی ہے وہ بھی کسی بے وفا لڑکی کی تصویر نہیں ہے، اس میں خود سپردگی بھی ہے اور خوئے وفا بھی اور بالعموم اظہار محبت میں پہل بھی اسی نے کی ہے:

برف برسائی مرے ذہن و تصور نے مگر
دل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحر کی زندگی میں جو لڑکیاں آئیں ساحر ان میں سے جسے بھی چاہتے اپنا بنا سکتے تھے مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ساحر نے اپنی بیشتر نظموں میں اس کا ذمہ دار اس سماجی ماحول کو قرار دیا ہے جہاں ہر چیز زر کی ترازو میں تلتی ہے۔ ساحر کا رقیب سرمایہ دار ہے اور وہ ان کی محبوبہ کو خرید لیتا ہے۔ ان کی حیات معاشقہ سے متعلق لگ بھگ ہر نظم یہی کہانی دہراتی ہے، یہاں صرف ایک نظم کا حوالہ کافی ہے جس کا عنوان ہے 'شکار'۔

مصور! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں
تبسم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدگی بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے، مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاق عاجزی دے دے
مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

لیکن ساحر یہاں ایک ذہنی یا جذباتی مغالطے کا شکار ہیں۔ اگر قصہ صرف اتنا ہی ہوتا تو ایک مقام وہ آیا تھا جہاں ساحر بھی بآسانی محبوبہ کو چمکتی کار پیش کر سکتے تھے۔ اس حیثیت کو پہنچنے کے بعد بھی ساحر کی زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں مگر ان کی تنہائیوں کی ساتھی نہ بن سکیں۔ پھر اس کے اسباب کہاں تلاش کیے جائیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ ساحر کے انھی تلخ تجربات میں جن سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ میں نے اوپر ان کی نظم 'اسی دوراہے پر' کا ایک بند پیش کیا ہے جس کا آخری مصرعہ ہے:

میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اس مصرعے کی کلید ان کی یہی 'بیزار طبیعت' ہے جس نے انھیں زندگی بھر کسی کا نہ ہونے دیا اور اس بیزاری کے پیچھے وہی مشاہدات و تجربات ہیں جو ان کے پورے وجود میں کڑواہٹ اور ہراس بن کر سما گئے تھے۔ تائید مزید کے لیے ان کی نظم 'معذوری' کے یہ چند شعر بھی پڑھ لیجیے:

میں کہ مایوس مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
دل تمھاری شدت احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمھارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں

اپنے ماضی سے گریزاں، حال سے ناآسودہ اور مستقبل سے ہراساں ایک شخص سماجی ناانصافیوں اور نابرابریوں کے خلاف مسلسل احتجاج کرتا ہوا، نام نہاد مہذب معاشرے میں مردوں کی چیرہ دستیوں اور عورت کی پامالیوں پر کڑھتا ہوا، بھری پُری دنیا میں سب سے الگ تھلگ اپنی سلگتی ہوئی تنہائیوں کے صحرا میں سفر کرتا ہوا ایک کردار، ساحر کی پوری شاعری کا محور و مرکز ہے اور یہ شخص کوئی اور نہیں خود ساحر ہیں اور یہ کردار کسی اور کا نہیں، خود ساحر کا ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں ساحر کا یہ دعویٰ لفظاً بہ لفظاً درست ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

●◆●

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

علی احمد فاطمی (شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد، یوپی)

ترقی پسند شاعری اور ساحر لدھیانوی دونوں اکثر غلط فہمیوں کا شکار رہے ہیں۔ ترقی پسند شاعری کے بارے میں عام طور پر اور مخالف ذہن نے خاص طور پر بار بار کہا کہ ترقی پسند شاعری، نعرہ بازی کی شاعری ہے۔ اس میں خطابت، خارجیت اور مقصدیت کا غلبہ ہے۔ اسی نوع کے اعتراضات اور الزامات اور بھی ہیں جن کا کچھ تو وقت نے جواب دے دیا ہے اور کچھ آنے والا وقت دے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کا مرکز و محور محبت ہے اس لیے کہ زندگی کا بھی مرکز و محور محبت ہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ساحر پر مضمون لکھتے وقت بہت اچھی بات کہی ہے:

"دنیا کی ہر زبان کے ادب عالیہ کا موضوع عموماً محبت رہا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف ادب ہی نہیں بلکہ ہماری زندگی کا نظام کسی نہ کسی محبت کا مرہونِ منت ہے... ابتدائے محبت کی مدہوش کن رنگینیاں ہر سچے شاعر کے کلام میں موجود ہوتی ہیں..."

اب یہ الگ بات ہے کہ محبت کے انیک روپ ہوتے ہیں اور حقیقت کے بھی۔ میر کی مثنوی 'شعلۂ عشق' سے لے کر اقبال کی 'ذوق و شوق' کا مطالعہ کر جائیے۔ ولی نے تو اس سے بھی پہلے کہا تھا:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی ہو یا مجازی کا

ترقی پسند شاعروں نے اسی محبت کو اپنے زمانے کے تقاضوں اور ضرورتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بزرگوں سے قدرے الگ ایک نیا تصور اور راستہ بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ راستہ محض ان کا اپنا ہے وہ ایسا کہہ بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ اگر ایک طرف ان پر سماجی اور تاریخی دباؤ تھا تو دوسری طرف کلاسکیت کا رچاؤ اور مغربی ادب سے لگاؤ بھی۔ انھوں نے اگر ایک طرف حافظ، سعدی، کبیر، تلسی، غالب، اقبال وغیرہ کا مطالعہ کیا تھا (ملاحظہ کیجیے ذکر حافظ اور پیغمبر ابن حسن) تو دوسری طرف انگریزی کی رومانی شاعری اور دیگر انقلابات پر بھی ان کی گہری نظر تھی، انھیں رومان اور انقلاب کے باطنی رشتوں کا علم تھا۔ انھیں اس بات کا بھی علم تھا کہ انگریزی کی رومانی شاعری انقلاب فرانس کی مرہونِ منت ہے کہ فرانس کے انقلاب کا خون خرابہ اور انسان کی توہین و تذلیل نے ہی ان رومانی شعرا میں نئے انسان اور انسانی معاشرے کو دیکھنے کا خیال اور خواب پیدا کیا، جس میں فطرت کے ساتھ تصورِ رقص اور آزادی بھی شامل ہے بلکہ فطرت بھی آزادی اور خوش حالی کی علامت بن کر آتی ہے۔ اقبال نے فلسفۂ اسلامی، ہندی اور مغربی کو شیر و شکر کرکے جس طرح دنیا کو عشق و عمل کے حوالے سے حریت و انسانیت کا پیغام دیا وہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کا تعلق عالم انسانیت سے تھا۔ اختر شیرانی، حسرت موہانی، جوش وغیرہ نے محبت اور عورت کا جیتا جاگتا تصور پیش کیا وہ بھی ترقی پسندوں کے سامنے تھا۔ یہ پورا پس منظر خواہ وہ مقامی ہو یا عالمی ان سب کو محبت سے الگ کرکے دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ محبت کا دائرہ محبوب سے نکل کر انسانیت، سماج اور وطن کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ترقی پسند شاعروں کو یہ تک کہنا پڑا:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
(فیضؔ)

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
(مجازؔ)

تبسم ہی نہیں صرف تلوار بھی ہے
وہ نظر ہی نہیں صرف جھنکار بھی ہے
(سردار جعفری)

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
...
(کیفی اعظمی)

ابھی دو مجھ کو محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں
(ساحرؔ)

ملاحظہ فرمایئے موضوعات تقریباً ایک سے ہیں لیکن سب کا انداز اور اسلوب جدا جدا ہے، اسی موقعے پر سردار جعفری کے یہ جملے بھی پیش کردوں تو غلط نہ ہوگا:

"ترقی پسند شاعروں کا محور رومان اور احتجاج ہے۔ فیضؔ کے یہاں محبوب کا وہ تصور نہیں ہے جو ساحر کے یہاں ہے۔ مخدوم و مجاز کی شاعری کا محور بھی رومان اور احتجاج رہا ہے مگر ان چاروں ہم عصر شعرا کے مزاج الگ الگ ہیں۔ مجاز کے یہاں سرفروشانہ سرشاری ہے۔ فیضؔ کے یہاں معشوق نواز حسن پرستی اور ساحر کے یہاں عاشقانہ انانیت ہے۔"

اسی انانیت کی جھلک غالب کے یہاں ملتی ہے:

وہ کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

دیکھیے بات پھر غالب تک پہنچ گئی۔ بات خواہ زنجیر و سلاسل کی ہو، حکایات خوں چکاں کی یا احتجاج ہونے کی۔ پہلی بار ترقی پسندوں نے نہیں کی یہ روایت بہت قدیم ہے۔ امیر مینائی نے بہت پہلے کہا تھا:

خنجر کہیں چلے پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اردو شاعری میں انسان دوستی کی روایت بہت قدیم ہے۔ تصوف کے حوالے سے زیادہ۔ ترقی پسند شاعروں نے صوفی ازم سے مارکسی ازم کا سفر طے کیا اور اپنے نئے جلال و جمال اور کیف و کم کے ساتھ منصوبہ بند طریقے سے ایک محاذ کی شکل میں پیش کیا۔ اب اعتراض تو اس بات پر بھی ہوسکتا ہے کہ ادب میں منصوبہ بندی اور محاذ آرائی کا کوئی دخل نہیں... ہوسکتا ہے یہ سچ ہو لیکن زندگی کا کوئی کام نظم و ضبط کے بغیر نہیں ہوتا اور جہاں ہوتا ہے وہاں انتشار ہوتا ہے اتحاد نہیں۔

ساحر کے سامنے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ بیشتر ترقی پسند شاعروں جن کی شہرت و مقبولیت کا سورج چمک رہا تھا ان سے چھوٹے اور جونیئر تھے۔ جب مجاز کی 'آہنگ' شائع ہوئی تو وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اقبال اور جوش مشرقی افق پر چھائے ہوئے تھے جن سے ہر ترقی پسند شاعر متاثر ہی نہیں مرعوب بھی ہو رہا تھا۔ غزل میں حسرت، فراق، جگر کا جادو چل رہا تھا، ایسے میں کسی نوجوان اور جونیئر شاعر کا اپنی راہ تلاش کرنا اور اپنی منفرد پہچان بنانا کس قدر مشکل کام تھا۔ ساحر بچپن کا جو ماحول اور زندگی گزار کر آئے تھے اس نے ساحر کو روکھا پھیکا اور چڑچڑا بنادیا تھا اور مستقبل کے جو راستے تھے وہ اس قدر بنجر اور خاردار تھے کہ ان سے شگفتگی اور دل کشی کا دور دور تک تعلق نہ تھا۔ شاعری اور فنکاری کے معاملات بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں، وہ اکثر ناہموار ماحول میں نمو پاتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، فرائڈ نے کہا ہے کہ انسان کی مایوسیاں اور محرومیاں ایک نئے جہان کا خواب دیکھتی ہیں اور تخلیق و تعمیر کی ایسی دنیا آباد کرتی ہیں جو اس کے لیے مثالی ہو، اس لیے زندگی میں اور شاعری میں خواب دیکھنا ضروری ہے۔ ساحر نے بھی خواب دیکھا، یہ الگ بات ہے کہ اس کا ماحول، اس کا ذہن اور وژن نے اس کی ذات کو کائنات سے وابستہ کردیا۔ وہ ان خاردار راہوں پر چل پڑے، ٹھوکریں کھائیں، لہولہان ہوئے، بے روزگار رہے، بھوکے بھی رہے لیکن یہی سب تکلیفیں اور اذیتیں شاعری کے لیے نعمتیں ثابت ہوئیں۔ انھوں نے کہا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر نے تکلیفوں بھرا سفر طے کیا
کہیں گھٹ نہیں کیا چٹان چپ چلے وہ

اپنی رومانی شاعری اس کے بعد فلمی گیتوں کے ذریعے دنیائے ادب اور فلم میں بے پناہ مقبول ہوئے۔ مشاعروں کا تو یہ عالم تھا بقول فراق: "آج بھی مشاعرے کے ٹکٹ ساحر کے نام پر بکتے ہیں"۔ ان کے شعری مجموعے 'تلخیاں' کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے اس کا اپنا ایک ریکارڈ ہے۔ ایسی غیر معمولی شہرت و مقبولیت تو اپنے آپ بہت سے سوال کھڑے کردیتی ہے۔ کچھ الزامات بھی مثلاً: "ساحر نوجوانوں کا شاعر ہے، ساحر فلموں کا شاعر ہے، ساحر عوامی شاعر ہے" وغیرہ۔ ایسے الزامات اکثر مخالف سمت سے زیادہ آئے جو عوامی شاعری کا دھندلا سا بھی تصور نہ رکھتے تھے۔ 'روشنائی' میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ کلکتہ میں وامق کے ایک گیت کے ذریعے لاکھوں روپے آئے جو قحطِ بنگال میں بڑے کام آئے۔ یہی حال ساحر کے نغموں کا تھا لیکن زندگی اور عوام سے دور کتابی نوعیت کے نقاد و دانشور اس مقبولیت کو عارضی اور معمولی گردانتے ہیں اور اسے ادب و تنقید کی نگاہ سے کمتر دیکھتے ہیں۔ اردو کی معیار پرست تہذیب و تنقید کے مسائل عجیب و غریب ہیں۔ یہاں کوئی لمبی بحث چھیڑنا ممکن و مناسب نہیں تاہم اتنا عرض کروں گا کہ ہندستان میں شاعری کی روایت کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اردو شاعری کے بارے میں بھی یہی کہا: "ان کروڑوں انسانوں کا روزمرہ کا جز ہے جن میں کئی ایک پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتے"۔ غالب صرف اس لیے کلاسک نہیں ہوئے کہ وہ مشکل شاعر ہیں اور ان پر آج بھی ریسرچ ہورہی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ان کے مصرعے آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ کبیر و تلسی سے لے کر ساحر اور کیفی تک اردو کے لاکھوں کروڑوں شائقین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کلاسیکی اور تاریخی حیثیت

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامیوں کے نتائج میں تاخیر ایک معمہ

ممبئی (یکم اکتوبر)۔ مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن ممبئی کی جانب سے کل 25 سبجیکٹ کے لیے ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء کو گورنمنٹ ڈگری کالجوں میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامیوں کے لیے اخبارات میں اشتہارات شائع ہوئے تھے۔ ایم پی ایس سی کی جانب سے ۹ فروری ۲۰۱۳ء کو امتحان کا انعقاد کیا گیا، اس کے بعد ایم پی ایس سی کی جانب سے امتحان میں زیادہ نمبرات حاصل کرنے والے امیدواروں کی میرٹ لسٹ شائع کی گئی اور کل 25 سبجیکٹ کے انٹرویو مختلف تاریخوں میں عمل میں آئے جس میں اردو مضمون کے لیے ۲۱ جولائی ۲۰۱۲ء کو ناگپور میں امیدواروں کا انٹرویو لیا گیا، مگر ایم پی ایس سی کی جانب سے کچھ مضمون کے انٹرویو کے نتائج تو فہرست کے مطابق اعلان کردیا گیا مگر بعد میں اردو کو بالائے طاق رکھ کر اردو مضمون کے بعد ہونے دوسرے مضامین کے انٹرویو کے نتائج کا اعلان کردیا گیا۔ آج دو ماہ گزر جانے کے باوجود بھی ایم پی ایس سی نے اردو مضمون کے نتائج کا اعلان کیوں نہیں کیا، یہ ایک معمہ بنا ہوا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اگنو بی ایڈ کورس اردو میں بھی پڑھانے کا نظام وضع کرے

نئی دہلی (۲۷ ستمبر)۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ہی ٹیچر ٹریننگ کورس بی ایڈ (فاصلاتی موڈ) کے لیے ملک بھر میں 347 اسٹڈی سینٹر چلا رہی ہے، لیکن کسی بھی سینٹر پر طلبہ کو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کا متبادل مہیا نہیں کرایا گیا ہے جب کہ ہندی اور انگریزی کے علاوہ تامل میں بھی اس کورس کو پڑھایا جارہا ہے۔ اگنو کے وائس چانسلر سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس جانب توجہ دیتے ہوئے کچھ ریاستوں کے طلبہ کو اردو کا متبادل فراہم کیا جائے۔ تعلیمی کاز کے لیے سرگرم ہولے حق ویلفیئر ایسوی ایشن کے صدر اسعد غازی نے اگنو کے وائس چانسلر پروفیسر ایم اسلم اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین کو مکتوب بھیج کر اس جانب ان کی توجہ دلاتے ہوئے کہا ہے کہ اگنو ملک بھر میں بی ایڈ (فاصلاتی نظام) کے 347 اسٹڈی سینٹر چلا رہا ہے، ہر سینٹر پر 100 سیٹیں ہیں۔ اس طرح ملک بھر میں کل 34700 سیٹیں ہیں۔ ان تمام ہی سینٹروں پر ہندی اور انگریزی میں کورس پڑھایا جارہا ہے جب کہ تامل ناڈو میں طلبہ کو یہ کورس تامل میں پڑھنے کا متبادل بھی فراہم کرایا گیا ہے۔ اس کے برعکس کسی بھی سینٹر پر اردو میں پڑھانے کا متبادل موجود نہیں ہے جب کہ اردو کو ملک کی راجدھانی دہلی، اترپردیش اور بہار وغیرہ میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر ریاستوں میں بڑی تعداد میں لوگ اردو پڑھتے لکھتے ہیں۔ اسعد غازی کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق مختلف ریاستوں کے 5 کروڑ 15 لاکھ 36 ہزار 111 افراد نے اردو کو اپنی مادری زبان کے طور پر اندراج کرایا تھا جب کہ دیگر ڈاٹا کے مطابق یہ تعداد 6 کروڑ 34 لاکھ 90 ہزار 86 افراد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر اگنو کو کم سے کم ان ریاستوں میں جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے، وہاں اس کورس کے طلبہ کو اردو میں بھی پڑھنے کا متبادل فراہم کرایا جانا چاہیے اور اس کے لیے ضروری اساتذہ کا انتظام بھی کرنا چاہیے۔

مرکزی وزارت اقلیتی امور کے تحت کشمر فار تھنکنگ مائناریٹیز پروفیسر اختر الواسع نے اس تعلق سے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ اس مطالبے کو جائز مانتے ہیں اور اس حق میں ہیں کہ اگنو کو بی ایڈ (فاصلاتی نظام) کورس ہی نہیں بلکہ ای ٹی ای کورس کو بھی اردو میں پڑھانا چاہیے اور یہ کام شروع کرنے میں اگنو کو کوئی تکلف بھی نہیں ہوگا کیوں کہ اگنو نے کئی اردو کورس شروع کیے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اس کے لیے نصاب اور نظام وضع کرنے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کی مدد کرسکتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے اس تعلق سے کہا کہ اگنو کو چاہیے کہ جو لوگ اردو میں اس کورس کو کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ سہولت فراہم کرائے اور اس کے لیے اردو میں نصاب اور اساتذہ بھی مہیا کرائے جائیں۔ خواجہ اکرام نے کہا کہ جہاں تک قومی اردو کونسل کی بات ہے تو اگنو کو اس تعلق سے جو بھی تعاون درکار ہوگا ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

اردو میڈیم اسکولوں میں تلگو مضمون پڑھانے کے لیے اساتذہ عدم دستیاب

نارائن کھیڑ، تلنگانہ (۲۷ ستمبر)۔ صدر آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس ایسوسی ایشن ضلع میدک جناب محمد عبدالکریم، سکریٹری محمد نظام الدین و دیگر عہدے داروں نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں بتایا کہ دسویں جماعت کے طلبہ کے لیے مضمون تلگو زبان دوم میں 35 فیصد نمبرات کامیابی کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے جب کہ گزشتہ سال تک صرف 20 فیصد نمبرات سے کامیابی ضروری تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس سال نصاب بھی تبدیل ہو چکا ہے اور اردو میڈیم اسکولوں میں تلگو مضمون پڑھانے کے لیے اساتذہ بھی نہیں ہیں۔ ایسوسی ایشن کے قائدین نے چیف منسٹر تلنگانہ جناب چندر شیکھر راؤ، ڈپٹی چیف منسٹر جناب محمد محمود علی، وزیر تعلیم جناب جگدیش ریڈی اور ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن تلنگانہ سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو میڈیم دسویں جماعت کے طلبہ کے لیے زبان دوم تلگو میں کامیابی کے لیے سابق کی طرح 20 فیصد نمبرات مقرر کیے جائیں۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

کرناٹک میں اردو میڈیم اسکولوں کو بند کرنے کی بات میں کوئی صداقت نہیں ۔۔۔وزیر تعلیم رتناکر کا بیان

بیدر، کرناٹک (۲۳ ستمبر)۔ ریاست کرناٹک میں کسی بھی رکن اسمبلی کی جانب سے ایسی کوئی تجویز نہیں آئی جس سے اردو میڈیم کے اسکولوں کو بند کیا جائے، یہ صرف افواہیں، کوئی بھی اردو اسکول بند نہیں کیا جارہا ہے۔ ہاں البتہ چند اراکین اسمبلی کی جانب سے ایک تجویز پیش کی گئی تھی کہ اردو میڈیم اسکولوں میں کنڑا کا ایک مضمون لازمی قرار دیا جائے تاکہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کررہے طلبہ کو آگے کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ بات وزیر تعلیم منسٹر رتناکر نے بتائی۔ وہ بیدر ضلع پنچایت آفس میٹنگ ہال میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ریاست کرناٹک میں جملہ 16000 اساتذہ کی اسامیاں خالی ہیں اور بہت جلد ان کو پُر کیا جائے گا۔ ان اساتذہ کی بھرتی کے لیے مقامی افراد کو فائدہ پہنچانے کے لیے ایک ہی دن کونسلنگ کی جائے گی۔ اس سے ایک امیدوار ایک ہی مقام پر اپنی درخواست داخل کرپائے گا، جس سے مقامی افراد ہی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بیدر ڈی ڈی پی آئی سے ملی تفصیلات کے مطابق بیدر ضلع میں پرائمری اسکول کی 875 اسامیاں خالی ہیں اور ہائی اسکول کی 138 اسامیاں خالی ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ سرکاری اسکولوں میں طلبہ کی تعداد کم ہونے کے باوجود اسکول کی جانب سے طلبہ کی تعداد کو بڑھا کر دکھایا جاتا ہے اور ایک لڑکے کا نام ایک نہیں بلکہ تین تین اسکولوں میں کو درج ہوتا ہے، اس لیے اس کو دور کرنے کے لیے سرکار کی جانب سے ایک سرکلر جاری کیا جارہا ہے کہ اسکول میں داخلہ لینے والے ہر طالب علم کی تصویر کے علاوہ طالب علم کے ماں باپ کی تصاویر بھی داخل کرنی ہوں گی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہر اسکول میں بیت الخلا اور پینے کے پانی کی سہولت کے علاوہ طلبہ کو دیگر بنیادی سہولتیں مہیا کرانے کے لیے ہر حلقہ اسمبلی کو 40 لاکھ روپیہ جاری کیے جائیں گے۔ اس موقعے پر صحافیوں کی جانب سے پوچھے گئے ایک سوال پر کہ طلبہ کو سی ای ٹی اور ٹی ای ٹی کے دو دو امتحان دینے پڑرہے ہیں جب کہ پہلے صرف سی ای ٹی کا ایک امتحان دینا پڑتا تھا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ سی ای ٹی امتحان پروفیشنل کورسس میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں اور ٹی ای ٹی امتحان ٹیچر بننے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ گزشتہ سالوں میں کئی ٹی سی ایچ یا ڈی ایڈ کرنے والے امیدواروں کا ٹی ای ٹی امتحان لیا گیا تھا جس میں سے ہزاروں امیدوار فیل ہوگئے، ایسے امیدوار اگر ٹی ای ٹی امتحان پاس کیے بغیر ٹیچر بن جاتے ہیں تو وہ طلبہ کو اسکول میں کیا پڑھائیں گے، اس لیے سرکار کی جانب سے ٹیچر بننے کے لیے ٹی ای ٹی امتحان ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر رکن اسمبلی منسٹر ایشور کھنڈرے، رکن کونسل منسٹر چا منور، محکمہ تعلیمات کے کمشنر منسٹر محمود، بیدر ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر پی سی جعفر موجود تھے۔

(سالار، بنگلور)

سرکاری اردو مدارس کو مساویانہ تقسیم سے مستثنیٰ رکھنے کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۹ ستمبر)۔ اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن تلنگانہ (سوتا) کے قائدین محمد انوار الباقی، محمد عبدالنعیم، محمد عبدالجبار افروز، محمد عبدالقدیر صدیقی، محمد خواجہ معین الدین، محمد صدیق احمد، ساجد الدین، نورالدین قادری، ماجد رحمان اور خواجہ فاروق الدین دہاج نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ جی او ۶، مورخہ ۲۲ ستمبر ۲۰۱۲ء کے تحت تلنگانہ ریاست کے تمام سرکاری/ضلع پریشد/منڈل پریشد اسکولوں کو مساویانہ تقسیم (ریشنلائزیشن) کے ذریعے ان مدارس کو بند یا ضم کردینے اور فاضل اساتذہ کو دوسرے مدارس میں منتقل کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جس کی وجہ سے کئی مدارس کے برخاست ہونے کا خدشہ ہے۔ سوتا قائدین نے مطالبہ کیا کہ مدارس کو ضم یا برخاست کرنے کی بجائے نئی نئی بستیوں میں ان مدارس کو منتقل کیا جائے اور اردو مدارس کو مساویانہ تقسیم سے مستثنیٰ کیا جائے۔

(سیاست، حیدرآباد)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو...

محترمی! ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے شمارہ نمبر 37 اور 38 میں آپ کے مضمون کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ اپنی دیرینہ معلومات اور تجربات کی روشنی میں آپ نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قومی اردو کونسل کی صورتِ حالات کا درست تجزیہ کیا ہے اور بعض تلخ حقائق کی نشان دہی کی ہے۔ سنگین اور کہنہ امراض کا علاج کڑوی دواؤں سے ہی ہوسکتا ہے۔ مریض کی بہتری کے لیے بعض اوقات اسے نشتر چبھونا اور انجکشن بھی دینا پڑتا ہے۔ قومی کونسل بھی متعدد امراض کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے جس کے لیے اردو دنیا کو نئے لائحۂ عمل مرتب کرنے کا عمل بحث و تمحیص سے شروع کرنا ہی ہوگا۔

وشوا ناتھ طاؤس

C-38 سیکٹر 39، نوئیڈا (یوپی) 201303

اشتہار نکالنے کے پانچ سال بعد بھی اردو اساتذہ کی تقرری نہیں

نئی دہلی (۳۰ ستمبر)۔ دہلی میونسپل کارپوریشن میں بھی اردو کا حال برا ہے۔ پانچ سال قبل کارپوریشن نے 200 اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے ایک سرکلر جاری کیا تھا مگر چار سال بعد امتحان ہوئے اور اس میں صرف 120 اساتذہ کو اہل قرار دیا گیا۔ بڑی افسوس کی بات ہے کہ جن 120 اساتذہ کا تقرر کیا گیا انھیں آج تک کسی بھی اسکول میں جوائننگ نہیں دی گئی۔ اطلاع یہ بھی ہے کہ امتحان میں 200 سے زائد امیدوار کامیاب ہوئے تھے مگر معمولی وجوہ پر انھیں نااہل قرار دیا گیا۔ ان 120 لوگوں کا میڈیکل ہوئے بھی تین ماہ گزر چکے ہیں مگر ابھی تک ان کی تقرری نہیں ہوئی جب کہ میڈیکل کے ایک ماہ کے اندر تقرری لازمی ہے۔

کارپوریشن بھی دہلی حکومت کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے یا یوں کہا جائے کہ شیلا حکومت میں بھی 200 اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے اشتہار جاری ہوا تھا لیکن ان اساتذہ میں سے بیشتر کی تقرری بڑی جدوجہد کے بعد ہو پائی اور باقی کو ناامیدی ہوئی۔ اس کے برعکس کارپوریشن تو دہلی حکومت سے بھی زیادہ متعصب معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپریل ۲۰۰۹ء میں کارپوریشن نے 200 پرائمری اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے ایک اشتہار نکالا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اشتہار کے چار سال بعد ۲۸؍اپریل ۲۰۱۳ء کو امتحان ہوا اور اس پر ستم یہ کہ اس امتحان کا نتیجہ ایک سال بعد یعنی کیم مارچ ۲۰۱۴ء کو آیا۔ اب اسی پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے کہ جب اشتہار ۲۰۰۹ء میں آیا تو پھر چار سال بعد امتحانات ہونے کے پیچھے کیا وجوہ ہیں۔ کیا کارپوریشن اس کا جواب دے گا کہ کیا دیگر لسانی اساتذہ کی تقرری کا عمل بھی اسی سست رفتاری سے چلتا ہے؟ کیا کارپوریشن نے برائے نام یہ اشتہار نکالا تھا۔ حد تو تب ہوئی کہ امتحان ہونے کے ایک سال بعد اس کا نتیجہ آیا۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں کارپوریشن کی نیت صاف نہیں تھی۔ کارپوریشن بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ اساتذہ کی تقرری میں عمر کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے، اب جب یہ معاملہ پانچ سال کا ہے تو ان اساتذہ کے پانچ سال بے کار ہونے کا حساب کون دے گا۔ اس کے علاوہ ۸؍مئی ۲۰۱۴ء کو ان لوگوں کے کاغذات کی جانچ ہوئی، لیکن ابھی تک ڈائرکٹر اور کمشنر نے اس فائل کو پاس نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے دو طرح کا نقصان ہو رہا ہے، ایک تو یہ اساتذہ بیکار ہو کر پریشان ہیں اور دوسرا یہ کہ کارپوریشن کے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔ اطلاع کے مطابق ابھی 120 میں سے صرف 100 لوگوں کی فائل اپروول کے لیے گئی ہے جس پر ڈائرکٹر اور کمشنر کے دستخط ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ فائل تینوں کارپوریشن میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے پاس جاتی ہے جہاں سے ان اساتذہ کو کارپوریشن کا اسکول الاٹ کیا جاتا ہے۔ نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے کورٹ ڈائرکٹر منظر علی خاں کا کہنا ہے کہ کارپوریشن جان بوجھ کر اردو اساتذہ کی تقرری میں تاخیر کر رہا ہے۔ پانچ سال گزر گئے لیکن ابھی تک ایک بھی ٹیچر کا تقرر نہیں ہو پایا۔ کارپوریشن کو اس کا جواب دینا چاہیے۔ اردو کے علاوہ بھی زبان کے ٹیچر کا تقرر بہت آسانی سے کر دیا جاتا ہے، مگر جب بھی اردو کی بات آتی ہے تو بہانے بازی شروع ہو جاتی ہے۔

(انقلاب، دہلی)

اردو اسکولوں کے تحفظ اور معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے حکومت کو تجاویز پیش کی جائیں

ہوسکوٹے، کرناٹک (۲۹ ستمبر)۔ ریاست کرناٹک کے عوام یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے عصرِ حاضر کی تعلیمی ضروریات ادھوری ہی رہ جاتی ہیں جس کی وجہ سے والدین نے اپنے بچوں کو غیر اردو اسکولوں میں داخلہ دلوانا شروع کر دیا اور دن بدن اردو اسکولوں میں طلبہ کی تعداد تشویش ناک حد تک گھٹتی گئی اور کئی اردو اسکولس بند بھی ہو گئے، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ بچوں کو غیر اردو اسکولوں میں بھیجنے والے والدین کی یہ شکایت عام ہے کہ ہمارے بچے ساتویں جماعت تک اردو میں پڑھ کر آٹھویں کا رخ کریں گے جب کہ انگریزی اور کنڑا زبانوں کا بول بالا ہے۔ سماجی کرانا کا یہ نظریہ ہے کہ والدین جن زبانوں کی تلاش میں اردو سے دور ہوکر دوسرے اسکولوں کا رخ کر رہے ہیں ان زبانوں کی موثر تعلیم کو اردو اسکولوں میں بھی شروع کیا جائے جس کے تحت مسلمانوں کے بچے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور کنڑا کی تعلیم حاصل کریں اور غیر اردو اسکولوں میں جو بچے پڑھ رہے ہیں انھیں لازمی طور پر ایک سبجیکٹ اردو پڑھنے کا نظم کیا جائے اور اردو اسکولوں کی خستہ حالت کو سدھارنے کی غرض سے اردو، انگریزی اور کنڑا زبانوں کی معیاری تدریس کے لیے اساتذہ میں بیداری کے ساتھ ساتھ مزید بہتر ذمہ داریاں ترتیب دے کر حکومت سے گزارش کی جائے کہ اس لائحۂ عمل کو تعلیمی سال ۲۰۱۵-۱۶ء سے شروع کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار صوبائی صدر کرانا فیاض الدین نے کرانا کے عہدیداروں سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں کرناٹک اردو اکادمی کی چیئرپرسن فوزیہ چودھری سے بھی بات ہوئی ہے اور محترمہ نے کرناٹک اردو اکادمی سے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ شیخ فیاض الدین نے کہا کہ اردو اسکولوں کے سدھار میں انقلاب پیدا کرنے کی غرض سے بی ایم ابراہیم، آر روشن بیگ، تنویر احمد اور قمرالاسلام جیسے قائدین سے ملاقات کر کے انہی کی قیادت میں کام کیا جائے گا۔ صدر کرانا نے ہسکوٹے تعلقہ کے صدر خلیل اللہ صاحب سے ملاقات کر کے اردو اسکولوں کے مسائل پیش کرتے ہوئے گزارش کی کہ وہ تعلقہ کے اردو تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں تعاون کریں۔

(سالار، بنگلور)

اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن بیدر کی وزیر تعلیم رتنا کر کو میمورنڈم

بیدر، کرناٹک (۲۳ ستمبر)۔ کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن ضلع بیدر کا ایک وفد ریاستی وزیر برائے ابتدائی و ثانوی تعلیم منسٹر کے رتنا کر سے دورۂ بیدر کے دوران ان سے ملاقات کر کے تمام اردو اساتذہ کی جانب سے ان کا خیر مقدم کیا اور اس موقع پر ایک یادداشت وزیر موصوف کو پیش کی گئی جس میں ضلع بیدر کے اردو اساتذہ کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور اردو مدارس کی صورتِ حال سے واقف کرایا گیا۔ یادداشت میں بتایا گیا ہے کہ اساتذہ کے پروموشن کے موقع پر شہری علاقوں پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے جب کہ اردو پرائمری و ہائی اسکول شہری علاقوں میں ہی قائم ہیں جس سے ماڈل پرائمری اسکولوں پر مدرس معلمین کے تقرر نہ ہونے کی وجہ سے مدارس میں تعلیمی نظم و ضبط پر خراب اثر پڑ رہا ہے۔ یادداشت میں بتایا گیا ہے کہ ضلع بیدر میں اردو مدارس زیادہ ہیں لیکن آج تک تعلقہ سطح پر ایک بھی اردو کا ایجوکیشن انسپکٹر نہیں ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے ہر تعلقہ پر ایک ایجوکیشن انسپکٹر کا تقرر عمل میں لائے جانے کا ایسوسی ایشن مطالبہ کرتی آرہی ہے، اس کے علاوہ اردو مدارس میں تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے بہتر اقدام کیے جائیں۔ ہر تعلقہ سطح پر ایک اردو بی آر پی کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ کرانا کے وفد کو وزیر تعلیم نے ان کے مطالبات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے حل کرنے کا یقین دلایا۔ اس وفد کی قیادت جناب محمد اختر احمد خاں (صدر کرانا) نے کی، جب کہ ان کے ہمراہ ایسوسی ایشن کے تمام عہدیداران و اراکین بھی موجود تھے۔

(سالار، بنگلور)

محمد پور کے کنڑا اور اردو اسکولوں میں انگلش ٹیچر کے تقرر کا مطالبہ

چنتامنی، کرناٹک (۲۳ ستمبر)۔ تعلقہ محمد پور کے کنڑا اسکول کے ایس ڈی ایم سی صدر انجینا، خالد علی، انور پاشاہ، امجد پاشاہ، راجپا، ینجا اپا، ترسمہ اپا، نارائن سوامی، رمیش، بخش، ساجد علی، سبرمنی و دیگر نے چنتامنی بلاک ایجوکیشن افسر کے دفتر کے روبرو احتجاج کرنے کے بعد بلاک ایجوکیشن افسر محمد خلیل کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ہمارے گاؤں محمد پور کے کنڑا اور اردو اسکول میں گزشتہ کئی برسوں سے انگلش ٹیچر نہیں ہے، اس لیے گاؤں کے کئی والدین کو اپنے بچوں کو انگلش پڑھانے کے لیے چنتامنی ٹاؤن کے پرائیویٹ اسکولوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔ ان دونوں اسکولوں میں کنڑا اور اردو کی تعلیم تو ہو رہی ہے لیکن انگلش کی تعلیم بھی آج کے زمانے میں ضروری ہے اس لیے محکمۂ تعلیمات کو چاہیے کہ گاؤں کے کنڑا اور اردو سرکاری اسکولوں میں بچوں کو انگلش پڑھانے کے لیے اساتذہ کا تقرر کرے۔ گاؤں میں پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک کی تعلیم ہوتی ہے اس کے بعد آٹھویں جماعت کے لیے شہر جانا پڑتا ہے جس سے بچوں کو کافی پریشانی پیش آتی ہے اس لیے محکمۂ تعلیمات محمد پور گاؤں میں ہائی اسکول قائم کرے۔ محکمۂ تعلیمات کے افسران کو چاہیے کہ وہ گاؤں کے کنڑا اور اردو سرکاری اسکولوں کا جائزہ لیں لیکن محکمۂ تعلیمات کے افسران محمد پور گاؤں کے کنڑا اور اردو سرکاری اسکولوں کا دورہ ہی نہیں کرتے، اگر مہینے میں ایک مرتبہ محکمۂ تعلیمات کے افسران گاؤں کے ان دونوں اسکولوں کا دورہ کرتے رہیں تو اساتذہ کو بھی خوف رہے گا۔ بلاک ایجوکیشن افسر محمد خلیل نے میمورنڈم قبول کرنے کے بعد ان کو بھروسہ دلایا کہ عنقریب ہی ڈی ڈی پی آئی سے بات چیت کر کے محمد پور کے کنڑا اور اردو اسکولوں کے لیے انگلش اساتذہ کا تقرر کرنے کی کوشش کی جائے گی کیوں کہ چنتامنی حلقے کے بیشتر اسکولوں میں اساتذہ کی قلت بہت زیادہ ہے اس کے لیے محکمۂ تعلیمات کے افسران کو خط لکھا گیا ہے لیکن ابھی تک اعلیٰ افسران سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا ہے۔

(سالار، بنگلور)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے
دو کتابوں کا
آنا ضروری ہے

نام کتاب : رثائی ادب کے چند پہلو
مصنف : وسیم حیدر ہاشمی
ضخامت : ۲۱۶ صفحات
قیمت : ۲۴۳ روپے
ملنے کا پتا : B-10/43 شوالہ
دارانسی (یوپی)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
rasakidak@gmail.com

اردو ادب میں شاعری کے حوالے سے عصر حاضر میں کتابوں کی جس قدر بھرمار ہے ٹھیک اس کے برعکس اردو میں رثائی ادب کی کال ہے۔ یہ کال ہے کہ کوئی تنقیدی کتاب یا شعری مجموعہ منظر عام پر آتا ہے جس کی ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں بکثرت تقریر اکثر و بیشتر مل جاتے ہیں لیکن تخلیقی ادب یا تخلیقی تنقید سے زیادہ تر ادیبوں کے رشتے اب منقطع ہوتے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں وسیم حیدر ہاشمی صاحب کی جتنی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں سے مرثیہ سے متعلق مضامین کا انتخاب کرکے اسے 'رثائی ادب کے چند پہلو' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرکے رثائی ادب کے اثاثے میں ایک اور اضافہ کر دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب وسیم حیدر ہاشمی کے تیرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں واقعات کربلا، مرثیہ نگاری، انیس و دبیر کی مرثیہ و سلام نگاری کے ساتھ ساتھ دیگر شعرا کے رثائی ادب کا بھی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں رثائی ادب کے چند پہلو پر قدرے تفصیل سے مواد پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون 'کربلا اور اخلاقی اقدار' ہے، دوسرا مضمون 'مرزا دبیر کی شاعری کی چند اہم خصوصیات' ہے۔ تیسرا مضمون 'تعشق کے رثائی کلام میں تغزل' ہے۔ چوتھا مضمون 'تعشق کے رثائی کلام میں ۱۸۵۷ء کی جھلک' ہے۔ پانچواں مضمون 'مراثی انیس میں باطل کردار کی عکاسی' ہے۔ چھٹا مضمون 'کلام انیس رثائی ادب اور تغزل کا حیرت انگیز سنگم' ہے۔ ساتواں مضمون 'کلام انیس میں مظلومہ فاطمہ زہرا کا اجمالی جائزہ'، آٹھواں مضمون 'انیس کے سلام' (پروفیسر شارب ردولوی کا ایک مضمون)، نواں مضمون 'انیس (سوانح) کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ دسواں مضمون 'علامہ شبلی کی انیس شناسی' ہے۔ گیارہواں مضمون 'پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی انیس شناسی' ہے۔ بارہواں مضمون 'پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی انیس شناسی' ہے۔ تیرہواں اور آخری مضمون 'شاعر جمالی کی غزلوں میں ذکر و فکر کربلا' ہے۔ آخر میں Bibliography کے عنوان سے ان تمام کتب و رسائل کی فہرست ہے جس کے توسط سے اس میں شامل مضامین میں مدد لی گئی ہے۔

کتاب کے موضوع میں رثائی ادب کا تسلسل برقرار ہے۔ مرزا دبیر اور میر انیس اور مرثیہ کے کئی پہلو کے حوالے سے یہ کتاب بے حد اہم ہے۔ اس میں شامل مضامین صرف وقتی خانہ پری نہیں ہے بلکہ اس میں تنقید و تحقیق کی طرف باقاعدگی اور سنجیدگی سے توجہ دی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وسیم حیدر ہاشمی جہاں اچھے شاعر اور افسانہ نگار ہیں وہیں انھیں حضرت امام حسین سے بے انتہا عقیدت ہے اور اسی عقیدت نے مودت اہل بیت کی شکل اختیار کرلی اور انھوں نے واقعات کربلا کے موضوع کا انتخاب کرکے رثائی ادب کے بکھرے ہوئے لعل و گہر کو کتابی شکل میں یکجا کرکے مرثیہ کے قدر دانوں کو ایک خوب صورت تحفے کے طور پر پیش کیا ہے۔

○○○

نام کتاب : اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ
مصنف : ڈاکٹر سلیم حامد رضوی
مرتبہ : ڈاکٹر رفعت سلطان
ضخامت : ۲۹۰ صفحات
قیمت : ۲۹۰ روپے
ناشر : باب العلم پبلی کیشنز، شبستان اپارٹمنٹ، دوسری منزل، سید فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلز بھوپال ۔ ۴۶۲۰۰۱
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gamail.com

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی (مرحوم) نے تحقیقی مقالہ بہ عنوان 'اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ' ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھا تھا۔ یہ مقالہ ۱۹۶۵ء میں ادارۂ ادب و تنقید بھوپال نے کتابی صورت میں شائع کیا جس کی بھوپال کے اندر اور باہر ہر دو جگہ اردو حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اس مقالے میں بھوپال کے حوالے سے اردو کے تقریباً ۲۵۰ سالہ سفر (۱۷۰۷ء تا ۱۹۵۷ء) کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی ترقی کی تاریخ بھی مرتب ہو چکی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی تلاش و جستجو کا ہی نتیجہ ہے کہ بھوپال میں اردو زبان و ادب کی قدامت کا پتا چلتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں بھوپال کسی بھی صورت میں کم پایہ نہ تھا۔ کتاب کی تمہید میں مصنف نے مقالہ کے مقاصد، ماخذ، دشواریوں نیز بھوپال کی تاریخ پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی معنویت آج بھی برقرار ہے اور ایسا وقیع کام اب خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے اس لیے، ڈاکٹر رفعت سلطان نے اس کو نصف صدی کے بعد حال ہی میں دوسری بار ترتیب دے کر زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ۱۹۱۰ء میں بھوپال کے ایک معروف علمی خانوادے میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ سے ایم اے (اردو) اور بی ٹی کرکے انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ ڈاکٹر صاحب نے درس و تدریس کو بطور روزگار اپنا لیا اور حمیدیہ کالج سے منسلک ہو گئے۔ مذکورہ کتاب کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب 'تنقید کے خاکے' شائع ہو چکی ہے۔ انھیں زمانۂ طالب علمی ہی سے ادب سے لگاؤ رہا اور مقالے و ڈرامے لکھتے رہے۔ تحقیق و تنقید کے علاوہ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اعلا پایہ کے مقالہ نگار، ڈرامہ نگار اور ترجمہ نگار تھے۔ ان کی نثر سادہ، سلیس، عام فہم اور رواں ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں کہیں بھی بوجھل اور اکتا دینے والی اصطلاحات نہیں ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں بھوپال کے سیاسی و تمدنی پس منظر پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ بھوپال کی فرقہ وارانہ یک جہتی مثالی تھی۔ چنانچہ مصنف فرماتے ہیں کہ 'تمدنی حیثیت سے یہ دور ایسا ہے جس میں بھوپال یوپی کا خطہ معلوم ہونے لگا تھا۔'

دوسرے باب میں ریاست میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی تفصیل درج ہے اور یہ باور کیا گیا ہے کہ اٹھارویں صدی میں دلی سے پہلے ہی بھوپال میں اردو شاعری کی ابتدا ہو گئی تھی۔ بقول مقالہ نگار بھوپال کا پہلا شاعر قاضی محمد صالح (مثنوی اخلاق ۱۷۰۷ء) تھا اور ابتدائی دور میں یہاں مثنویوں کا چلن رہا۔ شاعروں نے یہاں بھی شاعری کو مذہبی تبلیغ اور اصلاح اخلاق کے لیے استعمال کیا۔ جہاں تک اردو کی ارتقائی منزلوں کا سوال ہے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اس کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے: (۱) دور اول ۱۷۰۷ء تا ۱۸۱۸ء، (۲) دور دوم ۱۸۱۸ء تا ۱۸۶۸ء، (۳) دور سوم ۱۸۶۸ء تا ۱۹۰۰ء، (۴) دور چہارم ۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۷ء، (۵) دور پنجم ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۹ء۔ ہر دور میں پہلے حصے میں شعری اور دوسرے حصے میں نثری تخلیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے کئی گمنام شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ کر نکالا ہے اور بھوپال کے حکمران خاص کر خواتین کا ذکر بھی کیا ہے جو خود اہل قلم تھے اور اردو ادب کی سرپرستی کرنے میں پیش پیش رہے۔ انھی کی مہربانیوں کے طفیل دوسری ریاستوں کے اردو شعرا اور دانشور بھوپال میں آکر بس گئے۔ اہم بات یہ کہ یہاں کے نوابوں نے قصیدہ گوئی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جس کی وجہ سے بھوپال میں صالح ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۸۵۹ء میں نواب سکندر بیگم نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا اور اردو کتابوں کی اشاعت اور ترجموں کا خاص انتظام کروایا۔ زیر نظر کتاب میں کئی ہندو، یورپین، اور خواتین شاعروں اور نثر نگاروں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ آزادی سے پہلے سرسید کی تحریک کا اس ریاست پر کافی اثر پڑا اور قلم کار غزل اور مثنوی سے ہٹ کر دوسرے اصناف جیسے نظم، ناول، افسانہ وغیرہ کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس دور میں معاشرے کی اصلاح، حب الوطنی اور قومی بیداری کی طرف کافی توجہ دی گئی۔ مصنف نے جہاں مختلف ادوار میں قلم کاروں کے تذکرے کا لحاظ اور ان کے نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے، وہیں دار الکتب، تعلیمی اداروں، صحافت کے ارتقا، اہم رسالوں و اخباروں، پبلشنگ ہاؤسز اور اہم شاعروں کا تذکرہ کرنا نہیں بھولے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، جاں نثار اختر، گیان چند جین، ڈاکٹر حسین احسن جعفری اور دیگر مشاہیر ادب کا، جنھوں نے بھوپال کی سرزمین پر ہمیشہ قدم رکھا، ذکر کیا ہے۔ ادبی تحریکوں اور آزادی کے بعد اردو کے سفر کو بھی بے لاگ و بے باک بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے اختتام پر ڈاکٹر رضیہ حامد کا تحریر کیا ہوا مضمون بہ عنوان 'بھوپال کے عصری اردو ادب کا اجمالی جائزہ' بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے جس میں بھوپال میں اردو کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ضمیمہ کتاب کو عصری معنویت عطا کرنے کی ایک کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی یہ کوشش بھوپال میں تحقیق و تنقید کے میدان میں مشعل راہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ مقالہ اس نوعیت کا مقدم کام تھا اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں چند غلطیاں در آگئی ہوں گی جن کا تدارک آگے جاکر دوسرے محققوں نے کیا مگر ان معنوی کوتاہیوں سے اس دستاویز کی حوالہ جاتی اہمیت کسی قدر کم نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نایاب کتاب کو دوبارہ منظر عام پر لانے کے لیے ڈاکٹر رفعت سلطان اور ڈاکٹر رضیہ حامد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ اردو لائبریریوں کے منتظمین اس کتاب کو اپنی لائبریریوں کی زینت ضرور بنائیں گے تاکہ نہ صرف اردو کے تحقیق نگار بلکہ عام طلبہ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

○○○

بقیہ: تو ابھی راہ گزر میں ہے...

صفحہ ۸ سے آگے

سے بڑا جرم خیال کرتے تھے، اگرچہ غیر مسلم جاں بازان وطن میں قوم پرستی کی کمی نہ تھی اور پہلی جنگ آزادی میں ہندو راجاؤں، فوجداروں اور عام سپاہیوں نے مسلمان نوابین اور مجاہدین کے شانہ بہ شانہ فرنگی مخالف مہمات میں بھرپور حصہ لیا تھا لیکن ملا اور نفسیاتی سطح پر مسلمان ہی نمایاں رہے تھے، نیز بہادر شاہ ظفر کی علامتی اور جنرل بخت خاں کی عسکری قیادت بھی اس امر پر دلالت کرتی تھی کہ جنگی بہادر کی اصل جنگ مسلمانوں کے خلاف تھی۔

اسے ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ اس دور کے علمائے کرام اور قائدین ملت نے اس حقیقت کو بھی فراموش کردیا تھا کہ ملت اسلامیہ ہند میں سرسید ہی وہ پہلے فرد فرض شناس اور جانثار وقت تھے، جنھوں نے 'اسباب بغاوت ہند' جیسی معرکۃ الآرا کتاب، نام نہاد غدر کے فوراً بعد وقت تصنیف کرکے نہ صرف ہندوستانیوں کا مقدمہ پیش کیا تھا اور بالخصوص مسلمانوں کو

'غداری اور بغاوت' کے سنگین سازشی الزامات سے بری الذمہ قرار دینے کی سعی مکمل کی تھی بلکہ ہندوستان کے انگریز حکام اور برطانوی ارباب اقتدار تک، سب کا ذہن صاف کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اس کے علاوہ بھی وہ تحریر و تقریر میں اپنے موقف کا اظہار مسلسل کرتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ انگریزی حکومت میں اعلیٰ منصب پر فائز رہنے کے باعث انھیں انگریز حکام سے ملاقات اور ذاتی تبادلۂ خیال کے مواقع اکثر فراہم رہتے تھے۔ فرخ آباد میں منعقدہ وائسرائے ہند کے دربار میں بھی مسلم معاشرے کے سب سے قد آور نمائندے سرسید ہی تھے۔

یہاں اس حقیقت کا ادراک بھی لازم ہے کہ سرسید نے اپنی مذکورہ تصنیف 'اسباب بغاوت ہند' کو نہ تو بازار میں برائے فروخت پیش کیا تھا اور نہ ہی اسے وسیلۂ آمدنی بنایا تھا، بلکہ خاموشی سے ایک مخصوص تعداد میں اس کے نسخے لندن مرسل کرائے تھے تاکہ وہاں کی پارلیمان میں پیش کیے جائیں اور حکومت برطانیہ کے ان ارباب اختیار تک پہنچائے جائیں جو ہندوستانی امور کے ذمہ دار و نگراں تھے۔ علاوہ ازیں چند نسخے ہندوستان میں برطانوی حکام کو بھی برائے ملاحظہ پیش کردیے گئے تھے۔ لائق ذکر ہے کہ ہندوستان میں مامور انگریز حکام میں وائسرائے سمیت اکثر افسران اعلا نے سرسید کی اس کاوش کی ستائش کی تھی اور سرکاری سطح پر غور و خوض اور بحث و تمحیص کی غرض سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی تیار کرایا گیا تھا گو یہ ترجمہ بھی ایک مدت تک عوامی نہیں کیا گیا تھا۔

سرسید کی اس کتاب کی اشاعت عام مدت بعد اس وقت ہوئی، جب طوفان سرد ہو چکا تھا اور انگریزوں کی عام مسلمانوں سے ناراضی اور بدگمانی کافی حد تک کم ہو گئی تھی نیز مسلمانوں کے تئیں ان کے عمومی معاندانہ رویے میں بھی کافی فرق آگیا تھا۔ یہاں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ تمام مسلمان من حیث المعاشرہ سرسید کے نظریات کے مخالف نہیں تھے، بلاشبہ اعلا مسلم طبقے میں ان کے ہم خیال اور ہمنوا موجود تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بعد میں انھیں رفقا کہاں سے میسر آتے اور مولانا حالی، علامہ شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے جید عالم ان کی تائید و حمایت کیوں کرتے۔ بہرکیف ایسے روشن خیال دانش وروں کی تعداد لائق انگشت شماری تھی۔ یہ تو تھا مسلم معاشرے اور اس کے قائدین کا رخ، دوسری جانب چند صاحب فہم برادران وطن کے علاوہ عام ہندو آبادی کی نفسیات یہی تھی کہ ان کے اوپر پہلے ایک طاقت غیر (یعنی مسلمان) مسلط تھے، اور اب ایک دوسری قوم بہ شکل فرنگی ان پر حکمراں ہو گئی تھی، اس لیے ان کے لیے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ یاد رہے کہ وقت شناس اور زمانہ شناس غیر مسلموں نے عہد سلطنت سے ہی فارسی پڑھنا شروع کر دی تھی اور سرکاری ملازمتوں میں شراکت دار ہو گئے تھے، جب کہ عہد مغلیہ کے دوران تو کاروبار سلطنت کا اچھا خاصا بار غیر مسلم منصب داروں و عملداروں کے شانوں پر ہی تھا۔

جب اردو کا فروغ و عروج ہوا تو غیر مسلم حضرات کے اس مخصوص طبقے نے اردو میں اتنی اہلیت حاصل کی کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں مسلسل شریک و نمایاں رہے، اور اسی ذیل میں انگریزی کی ترویج و اس کی سرکاری حیثیت قائم ہوتے ہی ان حضرات نے انگریزی کی طرف توجہ کی۔ بنگال اور جنوبی ہند میں تو ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم کا چلن کافی پہلے ہو چکا تھا، شمالی ہند میں بھی غیر مسلموں نے مسلمانوں سے برسوں پہلے انگریزی کی باقاعدہ و باضابطہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی، اور اس طرح وہ تعلیمی و معاشرتی سطح پر مسلمانوں سے کہیں آگے تھے۔ سرسید جیسے مدبر نے ان تمام حالات و کوائف کا مطالعہ بڑی عمیق نظروں سے کیا تھا اور ان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر قوم مسلم اب بھی بیدار نہ ہوئی، اور اس نے وقت کے قدم بہ قدم چلنا شروع نہ کیا تو پھر اسے مزید تباہی کے بعد قعر مذلت میں گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

یہی پس منظر اور سرسید کی فکر دور رس ان کی تعلیمی تحریک کی پشت پر کارفرما تھے۔ لہٰذا انھوں نے کافی غور و خوض اور ذہنی شیرازہ بندی کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ بنایا۔ انھیں یقین کامل تھا کہ ایک سیاسی انقلاب کی ناکامی کے بعد اب ایک دوسرا، نیا انقلاب ہی مسلمانوں کی حالت میں مثبت تغیر لاسکتا تھا اور وہ تھا تعلیمی انقلاب، جس کے ذریعے اپنی قوم کو دوسری اقوام کے شانہ بہ شانہ و قدم بہ قدم ترقی کی راہ پر گامزن کیا جاسکتا تھا، یہی تبدیلی و ترقی ان کا نصب العین تھی۔ دراصل وہ ایک عظیم تبدیلی کے نقیب تھے، ایک ایسی تبدیلی جو مسلم معاشرے کو ایک نئی دنیا میں پہنچانے والی تھی۔ سرسید کی بلند بختی ان کی شناس بنی اور ان کی خوش بختی ان کے کام آئی۔ خوش نصیبی ان معنی میں کہ علما کی ایک بڑی جماعت اور اکثریت پرمبنی روایت پرست طبقے کی شدید مخالفت کے باوجود انھیں ایسے دانش مند، ہوش مند اور دور اندیش افراد خود اپنی قوم میں مل گئے، اور چند افراد برادران وطن کی صفوں سے بھی ان کی حمایت میں آگئے۔ جنھوں نے ان کی بات کو سنا، سمجھا اور ان کی مساعدت و نصرت کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے آمادہ ہو گئے۔ (یہاں واقعاتی تفصیل کی چنداں حاجت نہیں، کیوں کہ سرسید کے مشن اور علی گڑھ تحریک کے نشو و نما، ترقی اور اس کی ذی شان تاریخ سے اہل علم ہی نہیں عام پڑھے لکھے لوگ بھی بخوبی واقف ہیں۔)

(باقی آئندہ)

بقیہ: ساحر جو 'ہے' سے 'تھا' ہوگیا

صفحہ ایک سے آگے

ساتھ" عباس صاحب، سوال تو نہیں اٹھتا مگر لوگ تو اٹھ جاتے ہیں"۔

اس کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر آدھی رات کو منحوس ٹیلی فون کی گھنٹی بجی کوئی پوچھ رہا تھا "کیا یہ سچ ہے کہ ساحر لدھیانوی کا انتقال ہو گیا؟"۔

میں نے کہا "کیا بکتے ہو؟ وہ تو بھلے چنگے ہیں۔ ایسی افواہیں معلوم نہیں کون اُڑاتا ہے؟" بعد میں اُن کے گھر کا نمبر بتایا جو میرے گھر کے نمبر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ میرا نمبر ہے 572677 اور ساحر صاحب کا نمبر ہے 572637، اس لیے میں نے اس شخص سے کہا کہ وہ چاہے تو خود ان کے گھر ٹیلی فون کر کے اس خبر کی تردید کر سکتا ہے۔

دس منٹ بعد اس کا فون پھر آیا، کہنے لگا "میں نے ساحر صاحب کے یہاں بار بار فون کیا مگر کوئی جواب نہیں ملا" میں نے کہا "بس تو پھر یہ تردید کافی ہے۔ ان کا ٹیلی فون خراب ہوگا یا سب لوگ اس وقت سو رہے ہوں گے۔ گڈ نائٹ۔

مگر آدھے گھنٹے کے بعد ایک اور باوثوق دوست کا ٹیلی فون ساحر صاحب کے گھر سے آیا۔ انھوں نے بتایا کہ "ابھی ابھی ساحر صاحب کو ڈاکٹر کپور کے ورسوا والے گھر سے لائے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

تب جا کر مجھے یقین آیا کہ یہ 'ساحر' جو جوان کہلاتا تھا کیوں کہ سب سے پہلی فلم جس کے گانے اس نے لکھے تھے وہ 'نوجوان' ہی تھی۔ ساحر جو نوجوان نظر آتا تھا وہ 'کیو' کو توڑ کر ہم بوڑھوں کو پیچھے چھوڑ گیا"۔

●◆●

بقیہ: عشق اوّل و دردِ معشوق...

صفحہ ۳ سے آگے

اسے بھی نصیب ہوتی ہے جو خواص و عوام میں یکساں مقبول ہو۔

ساحر کی مقبولیت کی وجہ صرف نظم نہیں تھی بلکہ وہ شاعری ہے جو عشق سے شروع ہوتی ہے اور وہاں پر ختم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہ قول سردار جعفری: "عشق میں بھی وہ محبوب زیادہ رہا ہے اور عاشق کم۔ اس کی اپنی ذات اور اپنی شاعری اس کا سب سے محبوب موضوع سخن تھا۔ یہ چیز اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی جس کو فلمی کامیابی نے اور بھی چمکایا۔ یہیں سے ساحر کی شاعری میں واسوخت کے انداز سخن کا سراغ ملتا ہے جس کو اس نے ایک ترقی پسندانہ زاویہ عطا کر دیا۔ ساحر نے اس میں ایک طبقاتی پہلو شامل کر دیا اور شاعر کی امیر معشوق کو غریب شاعر کے طنز کا شکار بننا پڑا... اس کی شاہکار نظم 'تاج محل' ہے، اس نظم کا سارا نچوڑ آخری شعر میں ہے:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق"

ساحر نے ترقی پسندی کو اشتراکیت سے زیادہ رومانیت کے قریب کیا، اسے نئے مفاہیم دیے اور نئے اسالیب بھی، جو ساحر کی اپنی غیر معمولی خلاقیت اور انفرادیت کی پہچان بنتے ہیں جن پر فیض، مجاز وغیرہ کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں جس کے جواز میں ساحر خود کہتے ہیں: "سرقہ اور اثرات میں فرق ہے سو فیصدی اوریجنل کوئی نہیں ہوتا..." لیکن بعض معنوں میں ساحر اور مجاز تھے اس کا عکس قدیم لب و لہجہ اس کا اپنا درد، اس کی پیاس، اس کی محرومی جو نشاط میں بدل گئی اور عشق کا روپ لے کر نظموں کے نشاط میں رچ بس گئی، جس کی خوشبو، نزاکت، بہت وجاہت کو نئے سرے سے غور کرنے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔

●◆●

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب (صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں مضامین)	مرتبین: اطہر فاروقی، رضا حیدر، سرور الہدیٰ	۳۰۰/=
شاداب ہم ساتھ سیر گل کریں گے	کشمیری لال ذاکر	۳۰۰/=
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۳۰۰/=
دلّی کی درگاہ شاہ مرداں	خلیق انجم	۲۰۰/=
پہلا ورق (سہ ماہی اردو ادب کے منتخب اداریے) اسلم پرویز	انتخاب و ترتیب: شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی	۳۰۰/=
راس مسعود	حکیم سید ظل الرحمٰن	۲۵۰/=
ناممکن	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں اور دیگر افراد خاندان کے حالات)	مصنف: سرسید احمد خاں، مرتب: خلیق انجم	۱۵۰/=
ہندوستان میں اردو و سیاست کی تفہیم نو	اطہر فاروقی	۲۶۰/=
انقلاب ایک تاریخ، ایک تہذیب کی کہانی	عابداللہ غازی	۸۵/=
[illegible] (ڈرامہ)	ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی	۱۲۰/=
دوکان شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ)	شمیم حنفی	۲۰۰/=
دلّی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=

بہ موقع یومِ سرسیّد (۱۷/ اکتوبر)

پہلی قسط

تو ابھی راہ گزر میں ہے، قیدِ مقام سے گزر

علی گڑھ تحریک کو نئی معنویت کی تلاش

مظفر حسین سیّد (29/11، سرسیّد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

سیّد والا گہر، سیّد والا تبار، سیّد ذی شان، سیّد ذی جاہ، المعروف بہ سرسیّد کی نیک نامی لازوال اور شہرت دوامی ہے۔ جہانِ دانش میں عظمت و قد آوری کی ایک سند یہ بھی ہے کہ کسی صاحب عظمت، بلند قد ہستی کی اثر پذیری زمان و مکاں کی قید سے ماورا ہوتی ہے، اس کے آثار و اثرات صدیوں بلکہ الفوں کو محیط ہوتے ہیں۔ ارسطو تا غزالی و شاہ ولی اللہ تا ابوالکلام آزاد، ایسی مثالیں تاریخ علم و عرفان میں جابجا آویزاں ہیں۔ ایک عظیم قائد و رہبر کی خصوصیت دوم یہ ہے کہ اس کے معتقدین، مقلدین اور متاثرین کی تعداد خوب کثیر ہوتی ہے۔ ملتِ مسلمہ ہند میں سرسیّد خاں ایک ایسی واحد ہستی ہیں جن کے نام لیوا اور معنوی شاگرد، آج ملکی حدود سے تجاوز کر کے، چار دانگ عالم میں مصروف کار ہیں۔ سرسیّد ذی شان محض دانشور نہیں بلکہ دانشور ساز تھے۔ سرسیّد کی عظیم شخصیت، ان کی علمی اور ان کی خدمات پر صدہا کتابیں تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، ہزارہا مضامین سپردِ قلم کیے جا چکے ہیں۔ ان کی تعریف و توصیف و تنقید، حتیٰ کہ تنقیص میں دفتر کے دفتر سیاہ کیے جا چکے ہیں، جن سے کتب خانے معمور ہیں۔

پھر ایسی ہستی جاوداں پر خامہ فرسائی کی کون سی گنجائش اب بھی موجود ہے؟ تاہم اس ناسواد کے پاس اس جرأتِ رندانہ کا ایک جواز معقول ہے، اور وہ یہ کہ سرسیّد کی معنویت آج تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد بھی قائم ہے اور ان کے درس کی اخلاقی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ بڑے بڑوں نے ان کو سلام کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی اوائل عمری میں ہی سرسیّد کی عظمت کا ادراک کر لیا تھا، نیز اپنی تحریروں میں اس امر کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ بطور ثبوت ان کی ایک نگارش کا اقتباس ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

''سرسیّد کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کر لی، اور ہوا یہ کہ ایک عقیدت مند کی طرح جو اپنے شیخ و مرشد کی ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خریدنا چاہے، ان کی تصنیفات کا ہر ورق و صفحہ میں نے نہایت جد و جہد کر کے حاصل کیا۔

سرسیّد کی تصنیفات کے مطالعے نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا کیا، بلکہ ان کا شائق و گرویدہ بنا دیا۔ میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی۔ ہر وہ چیز جو ان کی طرف منسوب ہو، میرے قلب و ذہن کے لیے بمنزلہ معبود کے تھی۔''

(بحوالہ: آزاد کی کہانی)

ذرا غور فرمایئے، ایک نابغہ کی رائے اپنے جیسے نابغہ کے بارے میں کیا تھی۔ اگرچہ بعد ازاں مولانا آزاد کو علی گڑھ تحریک کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہوا، تاہم سرسیّد کی علمی و ادبی عظمت ان کے ذہن و دل میں ہمیشہ رہی۔

جواہر لعل نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں سرسیّد کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، بطور یاددہانی ایک اقتباس پیش ہے:

''سرسیّد کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے''۔

(بحوالہ: میری کہانی)

پنڈت نہرو کی اس توصیف کی اہمیت یہ ہے کہ سرسیّد کانگریس کے شدید مخالف تھے، لیکن اس کے باوصف نہرو نے ان کی خدمات سے صرفِ نظر نہیں کیا، بلکہ ان کی جہد منفرد کا اعتراف کیا۔ قابلِ ذکر ہے کہ سرسیّد والا مرتبت کے بارے میں سب سے گہری معنویت کا حامل جملہ برسوں پہلے راقم السطور کے استاذ محترم اور دورِ حاضر کے قد آور ترین افسانہ و ناول نگار قاضی عبدالستار نے ارشاد فرمایا تھا۔ پڑھیے اور سر دھنیے۔

''اگر سرسیّد نہ ہوتے تو ہندستان ہسپانیہ بن جاتا''۔

اس وسیع المعنی جملے کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں، جو ملتِ اسلامیہ کی جلیل الشان تاریخ اور اس کے عہدِ زوال اور ادوار پرآشوب کے احوال سے واقف ہیں، نیز تاریخ کے بین السطور مطالعے کے شعور سے مالا مال بھی ہیں۔ ایک فرسودہ نظام کے وارث اور ایک زوال آمادہ معاشرے کے افراد یعنی شمالی ہندستان کے مسلمانوں کو سرسیّد کی دعوتِ تحصیل علوم مغرب بڑی عجیب و غریب اور غیر فطری سی لگی، نیز ان کی نظر میں غیر روایتی تو تھی ہی۔ یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ اس دور، مشکلات اور ماحول خوف و ہراس میں کسی روایت سے انحراف ایک گناہ عظیم کے مترادف تھا، یوں بھی تب تک مسلم معاشرے کے عوام تو کیا خواص بھی انگریزی زبان اور انگلستانی طرزِ معاشرت کو ایک طرح حرام ہی خیال کرتے تھے، علمائے وقت کی اکثریت بھی نہ صرف بدلتے وقت کے تقاضوں سے بے خبر تھی بلکہ انگریز اور انگریزی کے خلاف فتوے پر فتوے جاری فرمانے میں مصروف تھی۔ ملت کو ان کی نجاست کا یقین دلانا، بارہا اس کا اعادہ کرنا اور ہمہ وقت ان کو نہی عن المنکر میں سر فہرست جان کر، ان سے اجتناب اور پرہیز کی تبلیغ، ان کے خیال میں فرض اولین کی حیثیت رکھتی تھی۔

اسی رجحان و رویے کے تحت سرسیّد کے ہر خیال کو نامبارک اور ہر قدم کو مفسدانہ قرار دے کر ان کے خلاف فتوے صادر کیے گئے، نیز انھیں کافر قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ علمائے عصر کی جماعت اس حقیقت سے لاعلم تو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن صرفِ نظر کر رہی تھی کہ کسی کلمہ گو، صاحبِ ایمان پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں کیا جا سکتا، تاوقتیکہ اس پر شرک خداوندی کا الزام شرعی طور پر ثابت نہ ہو جائے، یا اس فرد معاشرہ نے از خود اپنے ارتداد کا اعلان کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ سرسیّد کے باب میں یہ دونوں باتیں نادرست تھیں، مذہبی افہام و تفہیم میں ان کے نظریات سے اختلاف کی پوری گنجائش تھی، لیکن انھیں خارج از اسلام قرار دینے کا کوئی شرعی جواز کسی کے پاس نہیں تھا۔

سرسیّد عالی مرتبت نے تو جب جب مغربی علوم اور سائنس کی بات کی، قرآن حکیم کا ذکر سب سے پہلے کیا، جب جب اپنا تعلیمی زاویہ نگاہ پیش کیا، دینی تعلیم و اہتمام علوم اسلامی ہی نہیں عربی اور فارسی کو شریک نصاب بنانے کا اعلان اپنی ہر تقریر و تحریر میں ضرور کیا۔ درحقیقت اس دور ابتلا میں ملی قیادت، نیز عامۃ المسلمین کی ذہنی کیفیات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، کیوں کہ ان کی انگریز مخالف روش اور رویے کی پشت پر تاریخی عوامل کارفرما تھے، ابھی کل کی بات تھی، انگریزی استعمار نے انھیں محروم اقتدار کر کے دار و رسن کا مستحق قرار دیا تھا، سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا چراغ بھی گل ہو چکا تھا، اگرچہ یہ سلطنت اسلامی نہ تھی، تاہم مسلمانوں کے اقتدار و اختیار کی علامت تھی، اور مسلمانوں کو من حیث الجماعت یہی احساس تھا کہ وہ کل کے سلطان تھے، اقتدار انہی سے چھینا گیا تھا اور انگریزوں کی اصل دشمنی اور عناد انہی کے ساتھ تھا۔ اگرچہ یہ بھی اتفاق رائے ہے مسلمانوں کو نہ اپنا اصل حریف اور اپنے عزائم کی راہ میں سب

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ـــ (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی
Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor: Mohd Arif Khan
پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں
Printer, Publisher: Shahid Khan
مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Proprietor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 2/-. Yearly: 85/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http://www.atuh.org. Phones: 23237212, 23237214